© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

قرآن کے اسالیبِ دعوت و استدلال

(۴)

(سلسلہ کے لیے دیکھیے المعارف جولائی ۱۹۷۱)

نسخ آیات کی حقیقت کیا ہے؟ اس بارہ میں دو طرح کی بحثیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ کون کون آیت ناسخ ہے اور کون کون منسوخ۔ دوسرے یہ کہ کیا نسخ آیات کے تصور سے علم الٰہی کی ہمہ گیری کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں تک اول الذکر نکتہ کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے کہ ہمارے ہاں سلف میں یہ مسئلہ متنازعہ فیہ نہیں رہا ہے۔ بلکہ ایک فقیہ اور مجتہد کے لیے جہاں دوسرے علوم کی تحصیل کو ضروری ٹھہرایا گیا ہے، وہاں ناسخ و منسوخ کے علم کو بھی اتنا ہی اہم اور ضروری تسلیم کیا گیا ہے، اس لیے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو گا کہ احکام و مسائل میں وہ کون آیات ہیں۔ جو محض عموم و اجمال کی ہیں اور کون متعین حکم کی حامل ہیں یا کن آیات کے تعین کو دوسری آیات کے تعین نے ختم کر دیا ہے اس وقت تک استنباطِ احکام کا کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتا۔ شاہ صاحب کا اس سلسلہ میں احسان یہ ہے کہ انھوں نے منسوخ آیات کے دائرہ کو چند آیات تک محدود کر دیا ہے۔ اور اگر زیادہ غور و تعمق سے کام لیا جائے تو ان چند آیات میں سے ایک دو کی بھی ایسی تشریح ممکن ہے جس سے نسخ کا دائرہ نسبتاً اور سمٹاؤ اختیار کرے۔

ہم سلف کے بارے میں یہ سوئے ظن نہیں رکھتے کہ اُن کو خدا نخواستہ قرآن کی عظمت کا پاس نہ تھا۔ یا وہ اس حقیقت سے نا آشنا تھے کہ نسخ آیات کے تصور سے علم الٰہی کی وسعتیں متاثر ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اگر ان کے ہاں اصول تفسیر اور فقہ میں یہ بات بطور اصول موضوع کے مان لی گئی ہے کہ قرآن حکیم نسخ آیات سے دوچار ہے تو ہمیں بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ ہمارے نزدیک قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کے ضمن میں اس بات کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی تفسیر و تشریح اس وقت تک صحیح نہیں قرار دی جا سکتی۔ جب تک کہ تاریخی طور پر ہم اس کو حق بجانب نہ ثابت کر سکیں۔ یعنی اگر قرآن حکیم نے ایک مخصوص معاشرہ پیدا کیا ہے اور احکام و مسائل کو اس معاشرہ میں سمو کر دکھایا ہے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم تشریح کی معونت میں سب سے پہلے اس معاشرہ کو دیکھیں، اور اس نقطۂ نظر کو اپنائیں، کہ اسلامی معاشرہ کے صحت مند عنصر نے احکام و مسائل میں کیا روش اختیار کی ہے اور انھوں نے جن پیمانوں کو تسلیم کیا ہے اور جن پیمانوں پر فقہ و اجتہاد کے غرفے تعمیر کیے ہمارے لیے بھی وہی پیمانے رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں بغیر کسی اظہار معذرت کے ہم نسخ کی صحت مانتے ہیں۔ اور کسی طرح بھی اس کو قرآن کی عظمت و وقار کے منافی نہیں سمجھتے۔

آیئے اس کے بعد دوسرے نکتہ کی جانب عنانِ توجہ کو پھیریں۔ اور یہ دیکھیں کہ نسخ کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے پیچھے شرائع و ادیان کا کون اصول کارفرما ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں کسی نامعقول اپچ کی ضرورت نہیں صرف قرآن کی ان دو آیات پر نظر ڈال لینا کافی ہے۔

۱۔ یمحو اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب۔ (رعد: ۲۹)	خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے
۲۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نات بخیر منھا او مثلھا۔ (بقرہ: ۱۰۶)	ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اُسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔

اول الذکر آیت میں، قانون فطرت کی تشریح ہے اس میں اس حقیقت کی پردہ کشائی کی گئی ہے کہ کائنات میں ارتقا کا جو قانون جاری و ساری ہے۔ وہ صرف اثبات ہی پر مشتمل نہیں۔ محو، یا مٹا دینا بھی اس کا ایک جزو ترکیبی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تکوینی سطح پر تمام نباتات یا حیوانات میں جو جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ بخط مستقیم نہیں ہوتیں یعنی یہ نہیں ہوتا کہ جو ہیولی ایک مرتبہ بنا۔ یا کسی حیوان کا جو نقشہ تیار ہوا، اس کو ارتقا کی آیندہ رفتار میں قائم رکھا گیا بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ آغاز میں کچھ صورتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کچھ ہیولے اور نقشے صفحۂ وجود پہ ابھرتے اور مٹتے ہیں اور پھر کہیں جاکر زندگی ایک تعین اختیار کرتی ہے اور سارا ارتقا کا ایک رُخ مقرر ہوتا ہے۔ اثبات و محو کا یہ قانون نہ تو محبّت کی طرفہ طرازیوں پر مبنی ہے۔ نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت ناتجربہ کار ہے۔ اور اس کے کچھ نقش بناتی اور مٹاتی ہے تاکہ آخرکار موزوں تر نقش تک رسائی ہو سکے۔ جیسا کہ ڈاروِن نے ازراہِ گمراہی سمجھا۔ بلکہ تغیّر و تبدل کے اس قانون کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا وہ محکم علم، وہ استوار حکمت، اور تاباں ادراک پایا جاتا ہے جو زندگی اور تکمیلِ حیات کے اصول سے اچھی طرح آشنا ہے۔ جس میں پہلے سے یہ بات طے ہے کہ ارتقا کا یہ قانون اس انداز و نہج سے چلے گا۔ یعنی جو نقش مٹتا ہے وہ اس لیے نہیں مٹتا کہ اس کو فطرت کی لاعلمی نے ابھارا ہے، بلکہ اس لیے مٹتا ہے تاکہ ارتقا کے فاصلے کو آگے بڑھا سکے۔ یعنی یہ محو و فنا، ارتقا کا ایک ناگزیر موڑ ہے، جس سے آگے نکل کر اثبات کی سرحدیں واضح ہو جاتی ہیں اور علمِ الٰہی یا اُمّ الکتاب میں یہ تمام کیفیتیں اور موڑ پہلے سے درج ہیں۔

اس آیت میں بھی اگرچہ سیاق کے اعتبار سے شرائع اور ادیان ہی مقصود ہیں۔ تاہم اس کے عموم میں فطرت کے عملِ ارتقا کی وضاحت زیادہ نمایاں ہے۔ ثانی الذکر آیت نسبتاً اس سے زیادہ متعین ہے۔ اس سے مراد خصوصیت سے شرائع و ادیان ہیں اس قانون ارتقا کا ذکر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی سطح پر مختلف نقوش مٹتے اور ابھرتے ہیں اور فنا و ثبات کا قانون ہر آن گنت نئے نئے نقش بناتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح تہذیب و تمدن کے دائرہ میں ہر ہر زمانہ میں شریعت بدلتی ہے، قانون متغیر ہوتا ہے، اور فقہ و معاملہ کی نئی نئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ اور جس طرح فطرت اچھے اور موزوں تر نقش کی تلاش میں زمان و مکان کے فاصلے طے کرتی ہے، ٹھیک اسی طرح انبیا علیہم السلام کی تعلیمات زمان و مکان کی مناسبتوں سے تغیّر و تبدّل کے نئے نئے مرحلوں سے گزرتی اور تکمیل و ارتقا کی آخری کڑیوں پر جاکر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ فلسفہ مذاہب کا یہ دلچسپ موضوع ہے کہ اسلام کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے کہ اس نے کن کن سمتوں میں۔ ارتقا کا کرشمہ دکھایا ہے اور تہذیب و تمدن کے اس آخری اور ارتقائی مرحلہ تک پہنچنے کے لیے انبیا علیہم السلام کی تعلیمات نے کن کن تغیرات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا سامنا کیا ہے یا ادب و شعر کی زبان میں یوں کہیے کہ اس قطرہ نے گہر ہونے تک کن کن اداہائے حُسن کو مستعار لیا ہے

کہنا یہ ہے کہ جس طرح تکوین کی سطح پر تغیر و ارتقا کا قانون نہ صرف یہ ہے کہ علمِ الٰہی کے منافی نہیں ہے، بلکہ اس کی حکمت و ادراک کا آئینہ دار ہے، اسی طرح سابقہ شرائع میں بھی نسخ و انشا کا قاعدہ، جانے بوجھے علم و عرفان کا نتیجہ ہے۔ اس لیے سوال یہ نہیں کہ شرائع میں تغیر و تبدّل کیوں رونما ہوا۔ بلکہ غور طلب یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ ہوا ابتر اور خوب ہوا۔ اور عین قانون ارتقا کے مطابق ہوا۔

اس وضاحت کے بعد یہ مسئلہ اپنی جگہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اگر خود شریعت اسلامی میں اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تدبیر و اصلاح نے نسخ آیات سے کام لیا ہے تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی یہ بھی فطرت کے اسی جانے بوجھے قانون کی کار فرمائی کا کرشمہ ہے کہ جس کے تحت پہلی شریعتوں میں تغیر و تبدل ہوا۔ فطرت اور قانونِ فطرت ہیں۔ یہی ہم آہنگی تو وہ شئ ہے کہ جس کی وجہ سے اسلام دنیائے فکر و دانش میں اس درجہ مقبول ہوا۔

احکام و مسائل کی اس بحث کے اختتام پر ایک برمحل اور مفید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احکام و مسائل کو بیان کرنے میں آیا قرآن حکیم نے الفاظ کی ظاہری دلالت ہی کو اہمیت دی ہے، یا معنی و مفہوم کی رعایت بھی ملحوظ رکھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں دریافت طلب بات یہ ہے کہ قرآن میں جب ہمیں کسی امر و نہی سے دوچار ہونا پڑے۔ تو کیا ہمیں ٹھیٹھ الفاظ کی پیروی کرنا چاہیئے یا یہ دیکھنا چاہیے کہ ان الفاظ کے پیچھے کون معنی جلوہ گر ہے۔ ظاہر ہے اس مسئلہ میں کسی نپے تلے کُلیہ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم میں دونوں کی طرح کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ جہاں تک تعبدیات معاملات، حدود، مواریث، حلال و حرام اور دیگر بنیادی مسائل میں قرآن کے اسلوبِ اظہار کا تعلق ہے بغیر کسی جھجک کے کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ دلالت ظاہری سے سرِمو انحراف اختیار نہ کیا جائے اور صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ وغیرہ اصطلاحوں کے وہی معنی سمجھے جائیں، جو متداول اور متفق علیہا ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اہل علم کے ہاں جانی بوجھی اور مسلمہ ہے کہ بعض مقامات پر ظاہر کے ساتھ یا ظاہر کے بجائے۔ معنی کی اہمیت زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ اس لیے اس بارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کوئی دو ٹوک رائے رکھنا مشکل ہے۔ اور بائیبل کے پیرایہ بیان میں یوں کہنا زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کا حق لفظ کو دو اور معنی کا معنی کو۔ یعنی نہ تو معنی میں ایسی وسعت پیدا کرو کہ اپنی صریح تر دلالت سے محروم ہو جائے اور باطنیت والحاد کی پیروی میں تم اصل دین اور صراطِ مستقیم سے ہٹ جانے پر مجبور ہو جاؤ، اور نہ ہر جگہ۔ الفاظ کی ظاہری دلالت پر اکتفا کرو۔ کیونکہ اس طرزِ تعبیر سے ممکن ہے تم تعبیر و تفسیر کے ان لطائف ہی سے محروم ہو جاؤ جن کو دین کی روح اور جان کہنا چاہیے۔ یہاں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم کا عام اندازِ بیان تو وہی ہے، جو ایک فصیح و بلیغ کتاب کا ہونا چاہیے۔ اس میں ارکانِ دین واضح ہیں، حلال و حرام کی حدود متعین ہیں اور اصولی مسائل کا بالکل وہی مطلب ہے جس پر کہ الفاظ یا پیرایہ بیان دلالت کناں ہے۔ اس میں کہیں گھپلا نہیں۔ ابہام نہیں اور معنی و تاویل کی بے جا وسعت نہیں۔ لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہے کہ یا تو دلالت لفظی میں کچھ پھیلاؤ ہے اور یا الفاظ محض علامت ہیں۔ اور دراصل مقصود معنی ہے۔

معنی کہاں کہاں مقصود ہے اور دلالتِ ظاہری کا دامن کہاں کہاں سمٹا ہوا ہے۔ اس کو جاننے کے لیے تین اصول ہیں:۔

۱۔ یا تو امر و نہی کے منطقی اور اندرونی تقاضے یہ کہتے ہیں کہ یہاں الفاظ کی ظاہری دلالت کے علاوہ معنی کی اور وسعتیں بھی ہیں۔ جیسے۔ والدین کے بارہ میں ارشادِ خداوندی ہے:

فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما	اور ان سے ہوں نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا
وقل لھما قولا کریما۔	اور ان سے بات کرو تو حدود تعظیم کے اندر رہ کر۔
(بنی اسرائیل: ۲۳)	

ظاہر ہے جہاں والدین کے ساتھ الفاظ کی حد تک گستاخی کے ساتھ پیش آنا۔ گناہ ہے۔ وہاں اس کے معنوں میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے قول و عمل سے کوئی ایسی بات روا نہ رکھی جاتے اور نہ ایسے حالات ہی پیدا کیے جائیں جن سے یہ روحانی اور نفسیاتی اذیت یا گھٹن محسوس کریں۔ الفاظ کا ظاہری مطلب اگرچہ صرف اسی قدر ہے کہ اولاد الفاظ کی حد تک کسی گستاخی کی مرتکب نہ ہو۔ مگر اس حکم کی منطق اور اندرونی تقاضا یہ کہتا ہے کہ اس میں حسنِ سلوک کی وہ تمام نفسیاتی جزئیات داخل ہیں کہ جن سے والدین کا احترام مجروح ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲- یا صحابہ کی وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ آیت میں جو لفظ آیا ہے اس کا اطلاق کن معنوں پہ ہوتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:-

ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (البقرہ: ۱۹۵) — اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو تمام ان خطرات سے دامن بچائے رہنا چاہیے جو ہلاکت یا موت پر منتج ہو سکتے ہوں۔ اسی بنا پر قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت جب ایک صاحب دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا تو لوگوں نے اس آیت کے حوالے سے کہا کہ اس نوجوان نے اپنے ہاتھوں ہلاکت خریدی ہے۔ اس پر حضرت ابوایوب انصاری نے جو اس معرکہ میں براہِ راست شریک تھے۔ لوگوں کو بتایا کہ آنحضرت کے زمانہ میں اس آیت کا مفہوم ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہلاکت و موت کو وہ شخص دعوت دیتا ہے جو جہاد میں شریک نہیں رہتا۔ جہاد میں شریک ہونا اور اس میں جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کرنا اس کے مفہوم میں داخل نہیں۔

۳- ایسا بھی ممکن ہے کہ آیت میں بعض الفاظ کنایہ پر مبنی محاورہ پر مشتمل ہوں لیکن اس کا احتمال بھی ہو کہ ان سے وہی معنی مراد لیا جائے جو بظاہر الفاظ سے متبادر ہے۔ جیسے سحری کے بارہ میں قرآن حکیم میں ہے:-

وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ (البقرہ: ۱۸۷) — اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے ظاہر ہو جائے۔ سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے۔ فجر کے وقت۔

عدی بن حاتم نے اس کے ظاہری معنی مراد لیے، اور سچ مچ یہی سمجھے کہ اس سے مراد سوت کا سیاہ ڈورا اور سفید ڈورا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا نہیں۔ اس سے مراد بیاضِ نہار اور سوادِ لیل ہے۔

© rasailojaraid.com